کرتا ہے کہ اب اُس طریقۂ کار کی جانب بھی رہنمائی کی جائے جو فی زمانہ قیامِ خلافت کے لیے اختیار کیا جانا چاہیے۔ یہی مطالبہ پہلی کتاب کی اشاعت کے بعد مصنف سے بار بار ہوتا رہا' جس کا تذکرہ دوسری کتاب کے آغاز میں اس طرح کیا گیا ہے:

''دسمبر ۲۰۰۶ء میں راقم کی تالیف ''اسلامی نظامِ خلافت اور ہماری ذمہ داری'' منظر عام پر آئی تو اس سے استفادہ کرنے والے حضرات کی طرف سے یہ سوال اٹھایا گیا (جس کی پہلے سے قوی توقع کی جارہی تھی) کہ یہ بجا ہے کہ اسلامی نظامِ خلافت کا قیام اور احیاء تمام مسلمانوں کا بنیادی فریضہ ہے' لیکن موجودہ دور میں اس کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟'' [نمبر۱: پیش لفظ' ص ۱۳]

چنانچہ مصنف نے ایک منطقی ترتیب کے ساتھ بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے دوسری کتاب بعنوان ''عصرِ حاضر میں غلبۂ دین کا نبوی طریقۂ کار'' تالیف کی اور سیرت وسنت رسول ﷺ کی محکم اساسات پر عصرِ حاضر میں غلبۂ دین کے طریقۂ کار کو واضح کرنے کی عمدہ کاوش انجام دی ہے۔

اگر دِقت نظری سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان عنوانات پر کام اگر آج کسی خاص مکتبۂ فکر کی نمائندگی کرتے ہوئے سامنے آیا ہے تو یہ کسی خلاء میں نہیں واقع ہوا' بلکہ گزشتہ تین چار صدیوں کا تعامل ہے جو آج مولانا زاہد اقبال صاحب کی ان کتابوں میں بھی ایک جھلک دکھلا رہا ہے۔

جو حضرات گزشتہ دو صدیوں میں ظاہر ہونے والے تحریکی لٹریچر سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ غلبہ واقامتِ دین کی دعوت' بہت سی قدآور شخصیات کی معرفت اسی خطے میں بلند ہو چکی ہے' کبھی اس فریضہ کے لیے حکومتِ الٰہیہ کا عنوان اختیار کیا گیا' کبھی اقامتِ دین کا' کبھی نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا اور کبھی نظامِ خلافت کا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے قیام کے کسی نہ کسی طریقے پر بھی ان اصحابِ علم وفضل نے کچھ نہ کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی' جو کبھی تحریکِ خلافت کی صورت میں عمل کا آغاز کر کے تہے بام جا بیٹھی تو کبھی سیاسی وجمہوری غلام گردشوں میں اک صدائے بازگشت کی مانند سنائی دینے لگی اور کبھی دعوتِ قرآنی کی کوکھ سے برآمد ہو کر ''منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ'' کے نام سے ایک مبسوط تالیف قرار پائی اور ہنوز کسی مشعل بردار کے انتظار میں ہے ع

''ثبات اِک تغیّر کو ہے زمانے میں!''

## علم وفکرِ ولی اللّٰہی کا حسین امتزاج

گزشتہ صدیوں میں برصغیر پاک وہند میں اسلام کی علمیت دو حصوں میں منقسم دکھائی دیتی ہے۔ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات میں جو جامعیت دکھائی دیتی ہے اُس کا آخری پرتو شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت میں دکھائی دیتا ہے۔ شیخ الہندؒ کے بعد ''فکرِ ولی اللّٰہی'' اور ''علم ولی اللّٰہی'' دو علیحدہ علیحدہ چشموں کی صورت میں رواں دواں نظر آتے ہیں۔

علم ولی اللّٰہی کے وارث تو وہ علماء کرام ہوئے جو مدرسہ ومنبر کی رونق رہے اور قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کی صدائیں اس صنم خانۂ ہند میں بلند کرتے رہے۔ البتہ دوسری جانب فکر ولی اللّٰہی کے وارث وہ داعیانِ دین ہوئے جو قدیم وجدید کے امتزاج سے ایک درمیانی راہ کے راہی قرار پائے۔ ان کا تعلق ایک جانب قرآن

وسنت سے تھا تو دوسری جانب بدلتے ہوئے حالات اور زمانے کے تقاضوں سے بھی براہِ راست آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان افراد نے اجتماعی زندگی پر اسلام کے عادلانہ نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کا بیڑا اٹھایا اور اس محاذ پر فکری جنگ میں مصروفِ کار رہے۔ یہ دوئی ہمیں شیخ الہندؒ کے بعد اس طرح نظر آتی ہے کہ ایک جانب تو مولانا حسین احمد مدنی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہم نے علمِ ولی اللّٰہی کی حفاظت واشاعت کا کام سنبھالا اور دوسری جانب مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ذریعہ ایک دوسری شاخ برآمد ہوئی جو شیخ الہندؒ سے تصویب شدہ فکرِ ولی اللّٰہی کی وارث ہوئی اور زمانۂ حال تک یہ کڑیاں اس طرح بنتی دکھائی دیتی ہیں کہ بانی حزب اللہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد بانیٔ جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور اُن کے بعد بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہم۔

اس تمہید سے ہم اس نکتہ کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مولانا زاہد اقبال صاحب کی زیرِنظر ان دونوں کتابوں میں فکرِ ولی اللّٰہی کے دونوں اجزاء یعنی علم وفکر کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے، البتہ اس امتزاج کے مزاج میں کچھ تنگی کے پہلو ہیں جن کا ہم آگے ذکر کر رہے ہیں۔

## کمزور پہلو

جیسے کہ عرض کیا گیا، مولانا زاہد اقبال صاحب نے ولی اللّٰہی علم وفکر کو باہم مربوط کرنے کی جو خوش آئند کوشش کی ہے اس میں کچھ مسلکی تعصّبات کا رنگ ذائقے کو خراب کر دیتا ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ دونوں کتابوں کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف نے طرزِ آزادؒ فکر مودودی اور اسراری تعبیرات سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر زمانی اعتبار سے مقدم کتاب ''منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ از ڈاکٹر اسرار احمدؒ'' ہے جس میں غلبۂ دین کے نبوی طریقۂ کار کو چھ مراحل میں بیان کیا گیا ہے۔ زاہد اقبال صاحب نے اُنہی مقدمات سے بات کا آغاز کیا اور جزوی تبدیلی کے ساتھ پانچ مراحل کی نشاندہی کی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ کوئی بری بات نہیں کہ بعد میں آنے والے محققین گزشتہ مواد سے استفادہ کریں، مگر حوالے کا التزام مصنف کی دیانت داری اور حسن معاملہ میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح پہلی اور دوسری کتاب میں جہاں جہاں غلبۂ دین کے حوالہ سے پیش رفت کا جائزہ لیا گیا ہے وہاں علماء دیوبند کے کارناموں کا تو بڑی فراخدلی سے تذکرہ ہے مگر جماعت اسلامی یا مولانا مودودیؒ و دیگر کے کارہائے نمایاں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے، جبکہ مصر میں اخوان المسلمون کی کارکردگی کو عمدگی کے ساتھ جائزہ کا حصہ بنایا گیا ہے۔

ہمارے خیال میں اس رویے کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک جو سوءِ ظن پر مبنی ہے وہ یہ کہ مصنف نے مسلکی تعصب سے کام لیا ہے، اور دوسرا جو حسنِ ظن پر مبنی ہے وہ یہ کہ مصنف نے حکمت عملی کے تحت برصغیر کے متعصب ماحول کے پیش نظر علماء دیوبند کو اپیل کرنے اور کام پر آمادہ کرنے کے لیے مصلحتاً دیگر کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھا۔ تیسرے امکان کو ہم باور نہیں کر سکتے کہ فاضل مصنف نظامِ خلافت اور غلبۂ دین کے حوالہ سے دیگر حلقوں کی سعی وجُہد سے بے خبر ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دوسرا سبب ہی راجح ہے۔ واللہ اعلم! (باقی صفحہ 74 پر)